پرانا لاہور اور اسکی تہذیبی روایتیں

ہر شہر خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اس کی اپنی ایک تاریخ، تہذیب اور تہذیبی روایت ہوتی ہے۔ جیسے جیسے کوئی شہر پرانا ہوتا جاتا ہے تو اس کی تاریخ اور روایات میں بھی وسعت آتی جاتی ہے اس لحاظ سے لاہور کی تاریخی اور تہذیبی روایات کا ذخیرہ بے پایاں ہے اور ہر دور میں ان روایات میں اضافہ و ترمیم ہوتی رہی ہے۔ مثال کے طور پر اندرون شہر کے بعض محلوں کے نام مغلیہ فوج کے پیشوں سے موسوم تھے۔ مثلاً محلہ تیر اندازاں' محلہ تیر گراں' بارود خانہ' بازار صدا کاران کوچہ چابک سواراں وغیرہ۔ لاہور چونکہ زمانہ قدیم سے پنجاب کا دارالحکومت چلا آرہا ہے اس لئے اس شہر کی وسعتوں میں بھی اسی حساب سے اضافہ ہوتا رہا ہے۔ مختلف سمتوں سے لوگ روٹی روزگار کے لئے کشاں کشاں اس شہر کا رخ کرتے چلے آرہے ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اسی طرح اہل علم و دانش' علماء' صوفیا بھی اس شہر میں کشاں کشاں وارد ہوتے رہے اور پھر یہیں کے ہو رہے اور ان علماء' صوفیاء اور اہل علم و دانش کی تخلیقات نے بھی اسی شہر میں جنم لیا۔

لاہور کی تہذیبی زندگی پر بہت کم کام ہوا ہے ابتدائی کاموں میں مولوی نور احمد چشتی کی "تحقیقات چشتی" اور "یادگار چشتی" تقریباً ڈیڑھ صدی پہلے تحریر کی گئیں۔ یہ دونوں کتب انگریزی راج کے بعد انگریزی افسروں اور کمشنروں کے ایما پر وجود میں آئی تھیں۔ یادگار چشتی میں اندرون شہر میں بسنے والی مختلف برادریوں اور قبائل کی زندگی کی بے حد دلچسپ تفاصیل بیان کی گئی ہیں اور تحقیقات چشتی تو ایک طرف سر سید کی آثار الصنادید کی طرز پر لاہور کے مزاروں' مقبروں' مساجد گوردواروں اور گئو شالوں کی داستان ہے تو دوسری طرف لاہور کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں کنہیا لال کی تاریخ لاہور تخلیق ہوئی۔ انگریزی زبان میں تاریخ لاہور کے مصنف محمد لطیف تھے جو اس دور میں جج کے عہدے پر فائز رہے۔ انہوں نے ایک طرف پنجاب کی تاریخ پر ایک مبسوط تحقیقی کتاب تصنیف کی تو دوسری طرف انہوں نے لاہور اور ملتان کی تاریخ بھی قلمبند کی' لاہور پر ان کی انگریزی میں قلمبند کی گئی تصنیف 1896ء میں شائع ہوئی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد کے دور میں سب سے پہلے ڈاکٹر محمد باقر نے تاریخ لاہور پر ایک خاصی ضخیم کتاب تصنیف کی تھی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ لاہور کی تہذیبی زندگی پر کوئی تاثراتی کام نہیں ہوا لیکن اس قحط کے باوجود نقوش کے لاہور نمبر نے اس کمی کو ایک حد تک پورا کیا۔

میں نے 80 برس لاہور میں گزارے ہیں۔ میرے آباؤ اجداد بھی اسی شہر کے رہنے والے تھے۔ اس لحاظ سے میں خالصتاً فصیل کے اندر آباد لاہور کا باسی ہوں میں نے اس شہر کی زندگی کو قریب سے دیکھا ہے۔ میں نے 1958ء میں اندرون شہر اپنے آبائی گھر اور محلے کو خیر باد کہہ دیا تھا لیکن اندرون شہر کی زندگی اور اس کی روایات کو میں کبھی بھلا نہیں سکا۔ جب میں سیاسی جھمیلوں پر لکھ لکھ کر تھک جاتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ کچھ گزرے ہوئے دور کی باتیں ہو جائیں جن سے مجھے بے پناہ سکون ملتا ہے اور میری تھکان دور ہو جاتی ہے۔

ایک بات یاد رہنی چاہئے کہ شہر کوئی بھی ہو وہ کلیتاً ایک اکائی نہیں ہوتا اس لئے اندرون شہر کے ساتھ ساتھ سول لائنز بھی وجود میں آئی ہیں اور یہ سول لائنز صرف انگریزی دور کی ہی دین نہیں ہیں بلکہ یہ ازمنہ وسطیٰ میں بھی ہوتی تھیں۔ مغلیہ دور حکومت میں یہ جو مغلپورہ' باغبانپورہ وغیرہ کی بستیاں ہیں یہ اس دور کی سول لائنز تھیں جہاں "امراء اور شرفا" رہائش پذیر ہوتے تھے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ میں نے اس شہر کے اکثر علاقوں کو اجڑتے اور پھر بستے دیکھا ہے اس لئے اس پورے دور کے عروج و زوال کے بارے میں تاثرات خاص

حدیث دل

عبداللہ ملک

اہمیت کی چیز ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کے کالم کوئی تحقیقی کام نہیں ہو سکتے البتہ تحقیقی کام کے لئے یہ کالم خام مواد ضرور ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس شہر کی پرانی زندگی کے بارے میں سوائے یونس ادیب مرحوم کی "میرا شہر لاہور" کوئی بھی تاثراتی تصنیف میری نظر سے نہیں گزری۔ مثال کے طور پر چند دن ہوئے میں اپنے چند ہم عمر عزیزوں سے گپ کر رہا تھا کہ لاہور کے اشاعتی اداروں کا ذکر چل نکلا میرے بہت سے عزیز و اقارب اور بزرگ بھی ان اشاعتی اداروں سے منسلک رہے ہیں اور آج بھی میرے کئی ایک عزیز ان اشاعتی گھروں سے منسلک ہیں' چنانچہ اس گپ شپ کے دوران ہی مجھے یہ خیال آیا کہ کیوں نہ لاہور کے مختلف اشاعتی اداروں کے بارے میں دو چار تاثراتی کالم ہی تحریر کردوں۔

آج کے اہم اشاعتی اداروں کے مالکان کو اس طرف توجہ دینی چاہئے کہ وہ اس شہر کے اشاعتی اداروں کے بارے میں کوئی بڑا تحقیقی کام نہ سہی کم از کم تاثراتی کتاب یا کتب ہی شائع کریں۔ اب انیسویں صدی کے آخری دور میں قائم ہونے والے ادارے قومی دارالاشاعت نے ہماری ادبی اور تہذیبی زندگی کو نکھارنے اور اس کی تہذیبی بنیادیں مستحکم کرنے میں بے پناہ کام کیا۔ ان گنت کتب شائع کیں' بچوں اور عورتوں کے رسائل جاری کئے اور یوں ہماری تہذیبی روایات کو صحیح بنیادیں فراہم کیں۔ اس ادارے نے بچوں کا رسالہ پھول جاری کیا۔ اب نئے دور میں پھول کی آبیاری نوائے وقت کا ادارہ کر رہا ہے اور اس قومی دارالاشاعت نے کتابوں کے ساتھ ساتھ ادیبوں کو ادب اور صحافت کے میدان میں ایک مقام عطا کیا۔ عبدالمجید سالک' غلام عباس اور احمد ندیم قاسمی ان ادیبوں کی صف کا ہراول دستہ ہیں جن کا تشخص دارالاشاعت کے حوالے سے حاصل ہوا۔ امتیاز علی تاج' مولوی ممتاز علی مالک دارالاشاعت کے دوسرے صاحبزادے تھے۔ ان کا ادب میں نام اسی ادارے کے حوالے سے ہی شہرت کی بلندیوں پر پہنچا اور امتیاز علی تاج کا شہرہ آفاق ڈرامہ "انار کلی" مزاحیہ مضامین کا مجموعہ تھا اور چچا چھکن یہیں سے شائع ہوا تھا اور مولانا عبدالمجید سالک کی ترجمہ کی ہوئی ٹیگور کی مشہور عالم تصنیف "گیتان" بھی یہیں سے بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں شائع ہوئی تھی۔

یہ کتنی بدقسمتی کی بات ہے کہ نہ مولانا ممتاز علی جن کو اس زمانے میں شمس العلماء کا خطاب انگریز سے ملا تھا ان کی کوئی مفصل سوانح رقم ہوئی ہے اور نہ ہی دارالاشاعت کے عروج و زوال کے بارے میں کوئی کتاب رقم ہوئی ہے اس ضمن میں کم از کم میں اپنی جہالت کا اعتراف کرتا ہوں۔ بہرحال اسی دارالاشاعت نے حجاب امتیاز علی جیسی نابغہ روزگار افسانہ نویس اور ناول نگار کو متعارف کرایا جنہوں نے پوری نصف صدی تک اردو ادب کو متاثر کیا۔ لاہور کی تہذیبی زندگی میں ان کا سکہ چلتا رہا۔

شمس اللہ مولوی ممتاز علی کی بیگم محمدی بیگم نے تہذیب نسواں کا اجرا کیا تھا۔ وہ خود بھی اعلیٰ پائے کی ناول نگار تھیں۔ یہ درست ہے کہ ان کے بڑے بیٹا سید حمید علی صاحب علم و ادب کی اقلیم میں داخل نہیں ہوئے لیکن وہ جب تک زندہ رہے دارالاشاعت ایک اہم اشاعتی ادارے کے طور پر فعال رہا اور حمید علی صاحب کا شمار اس زمانے کے اہم ناشروں میں ہوتا تھا۔ امتیاز علی تاج اس کاروبار سے غالباً بہت پہلے الگ ہو گئے تھے دونوں بھائیوں میں بھی تعلقات کوئی زیادہ اچھے نہیں رہے تھے یہی وجہ ہے کہ جب امتیاز علی تاج کا قتل ہوا تو اس قتل میں بھی حمید صاحب کی اولاد کو ملوث کرنے کی کوشش کی گئی۔

آج میں پرانے زمانے اور اشاعت گھروں کا ذکر کرنے بیٹھا ہوں تو رہ رہ کر مجھے قومی دارالاشاعت واقع گوالمنڈی کا بغلی چوبارہ یاد آتا ہے جہاں مدتوں میرے محترم اور دوست ڈاکٹر سید محمد عبداللہ اپنے خاندان کے ساتھ مقیم رہے اور یہ چوبارہ اس وقت چھوڑا جب انہوں نے اپنا ذاتی مکان تعمیر کرالیا۔

پرانا لاہور...... کشمیری بازار سے اردو بازار تک

آج اکیسویں صدی کے شروع میں مذہبی اور دینی کتابوں کی اشاعت اور تجارت کا سب سے بڑا مرکز اردو بازار کہلاتا ہے۔ یہ آزادی سے پہلے کے زمانے میں موہن لال روڈ کہلاتا تھا اور یہاں پر سیکنڈ ہینڈ نصابی کتابوں اور نئی نصابی کتابوں کی فروخت کا کاروبار ہوتا تھا۔ یہاں پر کچھ خوش نویسوں کی بھی بیٹھکیں ہوتی تھیں۔ ایک بیٹھک سے جو اوپر کی منزل پر تھی' سہ روزہ زمزم نکلنا شروع ہوا تھا۔ یہ غالباً 1940ء اور 41ء کا زمانہ تھا اور اسی زمزم میں مجلس احرار کے مسلمہ رہنما چوہدری افضل حق اور مولانا بہاء الحق قاسمی والد محترم عطاء الحق قاسمی کے درمیان بعض مسائل پر عملی مباحثہ ہوا تھا' جو غالباً اسلام اور سوشلزم کے موضوع پر تھا۔

اس زمانے میں دینی کتابوں اور قرآن مجید کی اشاعت کا سب سے بڑا مرکز کشمیری بازار ہوا کرتا تھا اور اس دور کے بعض اشاعتی ادارے جو آج اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں وہ بین الاقوامی نوعیت اختیار کر گئے تھے کیونکہ وسطی ایشیا اور مشرق وسطی تک یہاں سے عربی اور فارسی میں چھپنے والی دینی کتب اور بالخصوص قرآن مجید کی طلب کو یہاں کے بہت سے ادارے پورا کرتے تھے اور تقریباً نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک کشمیری بازار قرآن مجید کی اشاعت کا سب سے بڑا مرکز رہا اور مدتوں پورے شمالی ہند میں یہ قرآن مجید کی فراہمی کی تھوک کی منڈی بنا رہا۔ یہ درست ہے کہ انیسویں صدی کے چل چلاؤ کے زمانہ میں منشی نول کشور نے لکھنؤ میں پریس نصب کر کے دینی اور ادبی کتب کی اشاعت کا بیڑہ اٹھایا جس نے اس قدر ترقی حاصل کی کہ اردو' فارسی اور عربی کتابیں اور نول کشور کے مطبع کا نام ہم معنی ہو گئے اور اس پڑھے لکھے شخص جس کو عربی' فارسی اور اردو سے ذرا سا بھی شغف ہوتا تھا اس کو نول کشور کے مطبع کی طرف ہی رجوع کرنا

عبداللہ ملک

پڑتا تھا۔ چنانچہ بقول مولوی فیروز الدین بانی فیروز سنز کے منشی نول کشور نے اس فراخ حوصلگی سے اشاعت علم کا کام کیا کہ تفسیر کبیر مصنفہ مولانا فخر الدین رازی جو تیس جلدوں میں ہے وہ مکمل انہوں نے ایک جلد میں چھاپی۔ ارزانی کے زمانے میں بھی اس کی قیمت تیس روپے کم تھی۔ ذرا اس اولالعزمی کو دیکھئے کہ صرف چند خاص علماء کے دیکھنے والی اتنی ضخیم کتاب چھاپنے کی جرأت کی تو منشی نول کشور نے ہی کی۔ طوطا مینا اور دوسری کہانیوں کے جب اس طرف آئے تو داستان امیر حمزہ وغیرہ جیسی ضخیم کتابیں بھی انہی کی مطبوعہ ہیں۔

کشمیری بازار کے ایک اشاعتی ادارے کا نام شیخ الٰہی بخش جلال دین اینڈ سنز تھا۔ میرے ہوش کے زمانے سے قبل ہی انتقال ہو چکا تھا۔ اس وقت ان کی آل اولاد میں فقط ظہور دین اس وسیع دکان پر بیٹھتے تھے۔ ان کے باقی بھائی بند دوسرے دھندوں میں مصروف تھے۔ ان کی اولادوں میں تین تو میرے ساتھ سکول میں پڑھتے تھے۔ ان میں سے ایک سعید الحسن میرے بہت ہی پیارے دوست تھے وہ بالآخر ایئر فورس میں چلے گئے تھے۔

یہ الٰہی بخش جلال دین فارسی' عربی اور اردو تینوں زبانوں میں تفسیر اور حدیث کی کتب شائع کرتے تھے اور ان کی شائع کردہ کتب اس دور میں وسطی ایشیا اور ایران تک جاتی تھیں۔ ہم لوگ اس زمانے میں وسطی ایشیا کے باشندوں کو اکثر اس دکان پر دیکھتے اور ان کے لباس کو ایک عجوبہ سمجھتے۔ اسی طرح ایک اور اشاعتی ادارہ "اللہ والے کی دکان" اس کے مالک ملک چنن دین سے میری خاصی قریبی رشتے داری تھی اور پھر اسی خاندان میں میرا چھوٹا بھائی بیاہا گیا تھا۔ یہ ادارہ خالصتاً تصوف پر کتابوں کی اشاعت کا کام کرتا تھا۔ اس دکان سے تصوف کی کتابیں مختلف پیر اور مشائخ بہ نفس نفیس خود خریدنے آتے تھے۔ آلو مہار شریف کے گدی نشین اور سجادہ نشین پیر فیض الحسن جو احرار کے جید رہنما تھے اور ان کے جیل کے ساتھی تھے۔ وہ قیام پاکستان سے پہلے جب بھی لاہور آتے تو میں ان کو اپنے گھر پر مدعو کیا کرتا تھا۔ وہ اللہ والوں کی دکان سے سینکڑوں کے حساب سے تصوف پر کتابیں خریدتے۔ میرا تجربہ ہے کہ بہت کم سیاسی لیڈر سیاست میں آنے کے بعد پڑھنے کا عمل قریب قریب ترک کر دیتے ہیں لیکن میں نے احرار کے لیڈروں میں چوہدری فضل حق سے لے کر جناب فیض الحسن کو مطالعے کا شوقین دیکھا' یہ شوق کمیونسٹ لیڈروں اور کارکنوں میں بدرجہ اتم پایا اور اس زمانے کے مسلم لیگی لیڈروں میں ممتاز احمد خان دولتانہ کا نام صف اول میں آتا ہے۔

اللہ والوں کی قومی دکان سے ہی اردو میں مکتوبات پہلی بار شائع ہوئے تھے' ویسے وہ فارسی میں ان مکتوبات کو بہت پہلے سے شائع کرتے چلے آئے تھے لیکن اردو میں شائع کر کے انہوں نے بڑا نام کمایا تھا۔

ویسے کشمیری بازار کو بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں جو شہرت حاصل ہوئی وہ قرآن مجید ہی کی اشاعت کی وجہ سے تھی۔ قرآن مجید اور دینی کتابوں کی نشرواشاعت کے کاروبار میں اس زمانے میں تین برادریاں پیش پیش تھیں۔ سب سے زیادہ پیش پیش ککے زئیوں کی برادری تھی اور ککے زئیوں کی گلی بھی کشمیری بازار ہی کی بغل میں تھی۔ چنانچہ ککے زئیوں میں جو لوگ اس تجارت میں پیش پیش تھے ان میں ملک دین محمد اینڈ سنز' ملک سراج الدین اینڈ سنز' اللہ والوں کی قومی دکان کے مالک چنن دین' ملک غلام محمد اور پھر شیخ محمد اشرف جنہوں نے انگریزی زبان میں علامہ عبداللہ یوسف علی کا قرآن مجید کی اشاعت کا 1934ء میں ڈول ڈالا' پھر شیخ ظفر محمد اینڈ سنز یہ سب ککے زئیوں کی برادری سے ہی تعلق رکھتے تھے اور اب بھی ان میں سے اکثر از خود قائم اور اردو بازار وغیرہ میں کاروبار کر رہی ہیں۔ دوسری برادری نارووالی شیخوں کی برادری تھی' جن میں شیخ غلام علی اینڈ سنز کا نام سرفہرست ہے اور یہ سلسلہ اب تک شیخ نیاز احمد اور ان کے برادر شیخ بشیر اور ان کی اولاد تک چلا آرہا ہے' گو غالباً شیخ بشیر کتابوں اور پریس کے کاموں سے لاتعلق ہو گئے ہیں لیکن شیخ نیاز اور ان کی اولاد ابھی تک کتابوں اور پریس کے کاروبار سے منسلک چلے آتے ہیں' شیخ نیاز اور بشیر غالباً شیخ غلام علی کے پوتے ہیں۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز نے نشرواشاعت کے کاروبار کو بہت ہی بڑھاوا دیا ہے۔ انہوں نے ہی مولانا غلام رسول مہر کی معرکتہ الآراء تاریخی اور تحقیقی کتب جو سید احمد شہید کی تحریک جہاد سے متعلق ہے تین جلدوں میں شائع کی' پھر انہوں نے قیام پاکستان سے پہلے دہلی کے مشہور انقلابی شیر جنگ کی دو کتب بھی شائع کیں۔ ان میں ایک مارکس کی تعلیمات پر تھی اور دوسری روسی انقلاب کی تاریخ تھی۔

نارووالی شیخوں میں شیخ برکت علی اور شیخ مبارک علی مرحوم بھی شامل تھے اور یہ شیخ مبارک علی ہی تھے جنہوں نے علامہ اقبالؒ کی تمام مطبوعات شائع کیں' پھر حفیظ جالندھری کے شاہنامہ کی اشاعت بھی انہی کے ادارے نے کی۔ ان کی دکان ایک تہذیبی اڈہ بھی تھا۔ اس زمانے میں چوہدری برکت علی کا پنجاب بک ڈپو یا ادب لطیف کا سرکلر روڈ پر موری اور بھاٹی دروازے کے سامنے والی روش میں ہوا کرتا تھا۔ یہ سب ادارے ایک داستان ہیں' جو بھولتی جا رہی ہے۔